© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

اساسیاتِ اسلام

(۴)

تعمیرِ فــــرد

سقراط نے بہت ٹھیک کہا تھا کہ انسان ہی ہر شئ کا معیار ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی تہذیبی نقشہ انسانی ضروریات کو پورا نہیں کرتا، کوئی عمرانی تصوّر انسان کے مضمرات ارتقا کو اُجاگر نہیں کرتا۔ اور کوئی فلسفہ یا دین انسان کے فکری، جذباتی اور عملی پہلوؤں کے لیے تسکین و ارتقا کا تسلی بخش سامان مہیا نہیں کرتا، بلکہ عقل انسانی کو مفلوج کرتا ہے اور خرد و دانش کے تقاضوں کا مضحکہ اُڑاتا ہے تو وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے دین نہیں ہو سکتا، اور زندگی کا وہ لائحہ عمل نہیں قرار پا سکتا کہ جس کو ہنسی خوشی انسان قبول کرلے، یا اگر بدرجۂ مجبوری اور بربنائے تقلید اس کو تسلیم ہی کرلے تو اس میں وہ مسرت، وہ اطمینان اور قلبی راحت محسوس کر سکے کہ جو سچے دین ہی کے ساتھ خاص ہے۔

دین یا فلسفہ کا اولین تعلق انسان سے ہے۔ اس کی روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ اس کے ذہن و فکر سے ہے۔ اس کی روحانی کیفیت سے ہے اور ان تعلقات سے ہے جو اس کو ایک معاشرہ کے سلک میں منسلک کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ تصوّرات وہ نقشے اور زاویہ ہائے فکر و نظر جن کو ہم دین یا فلسفۂ حیات سے تعبیر کرتے ہیں، ایسے ہوں کہ جن سے انسان فائدہ اٹھائے۔ یعنی جن سے اس کے ذہن کو تغذیہ حاصل ہو۔ جن سے اس کا باطن چمکے۔ جن سے ان میں ارتقائیت آئے۔ جن سے اس کی 'انا'، نفس و ذات کی حدبندیوں کو توڑ کر فضائے غیر منتہی کی وسعتوں تک تگ و تاز کر سکے اور جو اپنی فطرت اور ساخت کے اعتبار سے ایسے ہوں کہ ان کی بدولت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ہم رنگ انسان دوست صالح اور ترقی پذیر معاشرہ معرض وجود میں آسکے۔ فرد کی اصلاح و تعمیر کے پہلو بہ پہلو ہم صحت مند معاشرہ کی تعمیر کا اس بنا پر ذکر تے ہیں کہ فرد و معاشرہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اچھا معاشرہ، اچھے افراد کی تخلیق و پرورش کرتا ہے اور اچھے افراد عمدہ اور بہتر معاشرہ کو معرض وجود میں لانے کا سبب قرار پاتے ہیں۔ فرد اور معاشرہ دونوں ایک دوسرے سے غذا اور توانائی اور زندگی حاصل کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں ایک فرد معاشرے کی رہنمائی کرتا ہے۔ معاشرہ کو نئے نئے افکار و تصورات سے مالا مال کرتا ہے اور اپنی فکری و اجتہادی تازہ کاریوں سے تہذیب و تمدن کے مختلف گوشوں میں اس کو چمکاتا اور سنوارتا ہے۔ یا اپنی سیرت و کردار کی استواریوں سے معاشرہ میں نظم و توازن پیدا کرتا ہے۔ وہاں معاشرہ بھی فرد کے معاملہ میں کسی بخل کا اظہار نہیں کرتا۔ معاشرہ ایک فرد کو زندگی کی بندھی ٹکی روایات عطا کرتا ہے تصورات و عقائد دیتا ہے۔ اقدار بخشتا ہے اور تہذیب و تمدن کے مقررہ سانچے اور اسلوب مہیا کرتا ہے۔ یہی نہیں جہاں ایک اچھا اور صالح معاشرہ فرد کو اظہار ذات اور تکمیل و ارتقائے ذات کے وہ تمام مواقع عطا کرتا ہے کہ جن سے آگے کی راہیں اور منزلیں متعین ہوتی ہیں — وہاں ایک تاریک و تنگ نظر اور برا معاشرہ افراد کے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کو بری طرح متاثر اور مجروح کرنے کی بھی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ فرد کے ساتھ معاشرہ کو بھی افکار و تصورات کی صحت و استواری کا ضامن تسلیم کیا جائے اور بتایا جائے کہ اچھے، نیک اور ترقی پسند معاشرہ کے لیے کن اعلیٰ تصورات کی ضرورت ہے۔ کونسا نظام عمل موزوں ہے اور کس نوع کی آب و ہوا یا فضا کا ہونا مناسب ہے۔

مذاہب و افکار کے سلسلہ میں فرد و معاشرہ میں تعلق و روابط کی اس نوعیت کو اس وجہ سے سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ رشتہ و تعلق کی یہ نوعیت خود زندگی اور بقائے حیات کی ضروری شرط ہے۔ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ جس نظام فکر اور فلسفہ نے صرف فرد ہی کی اصلاح و تعمیر ہی کو اپنا نصب العین ٹھہرایا۔ وہ نہ صرف یہ کہ زندہ نہ رہا اور ایک خاص قسم کی رہبانیت کا شکار ہو کر رہ گیا، بلکہ وہ ایسے جلیل القدر اور تازہ کار افراد پیدا کرنے سے بھی قاصر رہا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ جو تہذیب و تمدن کے دبستان میں رونق و نکہت کا باعث ہو سکیں۔ اس طرح جن مدارسِ فکر نے صرف تنظیم، اجتماعی فلاح و بہبود اور معاشرہ کی بیرونی سطح ہی سے تعرض کیا۔ وہ ایسے خدا ترس حق آگاہ اور لطائف قلب کے حامل حضرات پیدا نہ کر سکے جو اخلاق سنوارتے ہیں، روح کو جلا بخشتے ہیں اور سیرت و کردار کے اعلیٰ نمونوں کی تخلیق کرتے ہیں۔

زندگی دراصل ایک وحدت ہے، جو فرد و معاشرہ دونوں میں یکساں اہمیت کے ساتھ دائرہ سائرہ ہے۔ اس میں ثنویت (DUALISM) کا تصور ہمیشہ گمراہ کن اور مہلک ثابت ہوا ہے۔ ہمارے عنوان تعمیر فرد سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ فرد معاشرہ سے الگ تھلگ ایک ذات ہے اور ہم ان میں حقیقی تقسیم کے قائل ہیں۔ ہم نے حقیقی تقسیم کی اس نوعیت کو محض سہولت فہم کی خاطر اختیار کیا ہے۔ ہم درحقیقت یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام نے جہاں معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہاں فرد کی نازک سے نازک ضروریات اور نفسیات کا بھی اس نے پوری طرح لحاظ رکھا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اس مرحلہ پر ہم اگر یہ دیکھتے چلیں کہ جہاں تک قدیم و جدید اسرائیلی مذہب کا تعلق ہے ان میں ایک انسان کی تمدنی ضروریات اور روحانی و اخلاقی تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا گیا ہے۔ اس موازنہ سے مقصود بحث و مناظرہ کا اظہار نہیں، بلکہ یہ غرض ہے کہ اسلام چونکہ اسی سلسلہ کی ایک تکمیلی اور آخری کڑی ہے اس لیے جب تک ان تصورات پر تنقیدی نظر نہ ڈالی جائے اور ان کے حُسن و قبح کا اچھی طرح جائزہ نہ لیا جائے ارتقا و تکمیل کے وہ حدود واضح نہیں ہو پاتے۔ جن کو اسلام نے متعین کیا ہے اور اس بات کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا کہ اللہ کے اس آخری دین نے تصورات ماسبق پر کس درجہ اضافہ کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں نوع انسانی کے دامنِ فکر کو عصدہ عمل کی کس دولتِ گراں مایہ سے آشنا کیا ہے۔

بغیر کسی تمہید کے پہلے یہودیت کو لیجیے۔ یہودیت کے بارہ میں جدید ترین اور اہل علم کے حلقوں میں مسلمہ تنقیدی اسلوبِ فکر یہ ہے کہ یہ دین سے زیادہ تاریخ ہے اور ارتقا کا ایک عملیہ ہے۔ جو ان افکار خیالات اور رسوم و عوائد کا آئینہ دار ہے کہ جس سے عبرانی خروج (EXODUS) کے بعد صدیوں تک دوچار ہوتے رہے۔ خروج سے پہلے کی کوئی دینی دستاویز محفوظ نہیں ہے اور عہد نامہ قدیم کے نام سے جو ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے وہ اسی تاریخ پر مشتمل ہے اور اس میں مندرجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیالات و افکار کو کوئی بھی پڑھا لکھا شخص وحی و تنزیل قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اہل علم کے نزدیک اس کی حیثیت محض ایسے لٹریچر کی ہے کہ جس میں یہودی فقہ، یہودی عوائد و رسوم اور یہودی تاریخ عقائد مرقوم ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ پہلے ہی قدم پر یہ سارا ذخیرہ اس قطعیت و یقین (CERTAINTY) سے محروم ہو گیا جو وحی و تنزیل کا خاصہ ہے۔ علاوہ ازیں اس میں چار بنیادی نقص ہیں:

(۱) یہودی فقیہوں اور فریسیوں نے یہودیت کے نام سے دین کے جس نقشہ کو پیش کیا ہے اس کا تعلق صرف انسان کی خارجی اصلاح سے ہے، قومی تنظیم سے ہے اور اس اجتماعی غلبہ و تسلط سے ہے کہ جو یہودیوں کو غیر یہودیوں پر حاصل ہونا چاہیے۔ اس میں زندگی کے اس جوہر لطیف سے تعرض نہیں کیا گیا جس کا مسکن دل ہے، باطن ہے اور جس سے مقصود انسان کو ایسے داخلی عوامل سے روشناس کرانا ہے کہ جو ایک طرف اس کو خارجی زندگی کے سنوارنے میں مدد دیں، اور دوسری طرف تعلق باللہ کے پہلو کو استواری بخشیں۔ یہی وجہ ہے اس نقشہ میں اونچے اور صحت مند تصوف کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ حکیم یہود (PHILO) کا معاملہ اس سلسلہ میں بالکل جداگانہ ہے (یہ مسیح سے کچھ پہلے پیدا ہوتے اور مسیح کے بعد کافی عرصہ تک زندہ رہے) ان کے فلسفہ تصوف میں ترک لذات، اور لوگاس (LOGOS) کے ذریعہ اتحاد باللہ کا تصور قطعی غیر عبرانی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے اسفار خمسہ سے کہیں زیادہ اس کا تعلق تو افلاطونیت (NEO-PLATONISM) سے ہے۔ لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو ان کا یہ عجیب و غریب دعویٰ ہے کہ تمام یونانی فلسفہ کتب مقدسہ سے ماخوذ ہے لیکن جب انھوں نے ایک مرتب نظام تصوف پر غور و فکر کیا تو اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ اسی نظام فکر کے لیے اسی ثروت علمی سے استفادہ کریں کہ جس کو یونانیوں نے مذاہب و ادیان سے الگ ہو کر ترتیب دیا تھا۔

(۲) کسی دین میں انسانی روح و باطن کی بالیدگی یا پرورش کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں رحمت و عفو اور تربیت کا پہلو نمایاں ہو اور سزا و عقوبت کا پہلو کم ہو۔ اصلاح انسانی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ عام حالات میں ہر ہر شخص کو نیک فرض کیا جائے۔ اس پر بڑی حد تک اعتماد کیا جائے اور اس کے قلب و ضمیر میں خدا کی دی ہوئی ایسی صلاحیتوں کو تسلیم کیا جائے، جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیم و تربیت سے جِلا پاکر شر کا مقابلہ کر سکتی ہیں اور شر پہ قابو پا سکتی ہیں۔ لیکن اگر بات بات پہ سزا و عقوبت کا اطلاق کیا جائے اور ہر ہر لغزش پر تعزیر و حدود کو حرکت دی جائے، تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ انسان دراصل نیک نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اس کی فطرت میں برائی داخل ہے۔ اس کی گھٹی میں شر مضمر ہے۔ لہٰذا بغیر عقوبت و سزا کی سختیاں جھیلے راہِ راست پر آنے والا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اصلاح کا یہ اسلوب صحیح نہیں۔ عقوبت و سزا کے معاملہ میں اس کا عدم توازن آخر آخر میں اس حد تک منجاوز ہو جاتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں پر بھی عظیم و سخت سزا تجویز کی جانے لگتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص "سبت" کا احترام نہیں کرتا تو بجائے کہ اس تساہل پر سرزنش کو کافی سمجھا جائے اور وعظ و تذکیر سے سبت کی اہمیت کا نقش دل میں بٹھایا جائے۔ تورات کے مرتبین اس کے لیے سنگ ساری کی ہولناک سزا تجویز کرتے ہیں۔ یہ لطیفہ بھی دیکھیے جریان محض ایک بیماری ہے مگر تورات کے مصنفین کے نزدیک یہ ایسی ناپاکی ہے کہ اگر کوئی ایسے مریض کو چھو لے تو وہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے[۱]

(۳) یہودی شریعت کا نسبتاً زیادہ المناک پہلو اس کی ہر ہر مسئلہ میں غیر ضروری، اور شاخ در شاخ تفصیلات ہیں کہ جن کو قرآن حکیم نے بجا طور پر طوق و سلاسل سے تعبیر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کی رحمت ان تمام زنجیروں کو کاٹ دینا چاہتی ہے کہ جن سے قلب و ذہن گھٹن کا احساس ہوتا ہے اور جو نشاط عملی کو روک دینے کا باعث ہوتی ہیں۔

تہذیب جس قدر سادہ اصولوں پر مبنی ہو گی اسی قدر حسین اور مقبول ہو گی اور اسی نسبت سے اس میں آگے بڑھنے اور قوموں کو آگے بڑھانے کی صلاحیتیں زیادہ ہوں گی، اور جس قدر پیچیدہ مفصل اور شاخ در شاخ تفریعات سے الجھی ہوئی ہو گی اسی نسبت سے انسانیت کے لیے وبالِ جان بن جائے گی۔ خود فطرت کے اس عظیم کارخانے کو دیکھیے جو ہمارے چاروں طرف اپنی اعجوبہ طرازیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس میں جو قوانین فطرت کارفرما ہیں وہ کس درجہ مختصر ہیں۔ یہی اختصار اور سادگی اس دینِ فطرت میں ہونی چاہیے کہ جسے انسان کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا ہے۔

---

[۱] احبار باب ۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) مذاہب و ادیان میں اللہ تعالیٰ کا تصور کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ تصور جس قدر اعلیٰ، منزہ، اور محبت، رافت، عفو، اور ربوبیت ایسی صفاتِ حسنہ سے اتصاف پذیر ہوگا اسی انداز سے دلوں میں نقش ہوگا، اسی انداز سے دلوں میں گھر کرے گا اور اسی انداز سے اس کے ساتھ عشق و مودت کے داعیوں کو وابستہ کیا جا سکے گا۔ یہودیوں کے تصورِ الٰہ میں اصولی نقص یہ ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لیے اچھا نمونہ (NORM) ثابت نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ اس کے ساتھ کسی اونچے روحانی تصور کو استوار کیا جائے۔ اس کی صفات میں جنگ جوئی، انتقام اور سخت گیری کا رنگ نمایاں ہے۔ مزید برآں اس کی رہنمائی، اصلاح اور سربراہی کا دائرہ صرف ایک مخصوص قوم فکر اور متعین تاریخ کی حد تک محدود ہے۔ اس کی ان صفات سے جن کا ذکر یہودی لٹریچر میں آیا ہے کسی طرح بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ذات گرامی ہمہ گیر اور زمان و مکاں کی حد بندیوں سے آزاد اور ماورا ہے بلکہ یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ان صفات کو یہودی قومیت کے تنگ نظرانہ اور سمٹے ہوئے تقاضوں نے جنم دیا ہے۔

عیسائیت کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے۔ اس میں اور یہودیت میں منطقی لحاظ سے نسبت تضاد واقع ہے۔ یعنی اسے یہودیت کا جواب دعویٰ (ANTITHESIS) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہودیت کے معنی اگر قانون و شریعت کی لاطائل اور غیر مکمل جزئیات کا استیعاب تھا تو پال نے سرے سے شریعت و فقہ کی ضرورت ہی سے انکار کیا اور کہا کہ شریعت کی پابندیاں روح و قلب کی شگفتگی کی موت میں۔ شریعت ایک بے جا قدغن اور غیر مفید بلکہ مضر التزام ہے۔ جس سے قلب و روح کی زندگی معرضِ خطر میں پڑ جانے کا خطرہ ہے۔ اس نے شریعت کو بائبل کی زبان میں لعنت قرار دیا۔ اس کا حکیمانہ مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ پال انسانی اصلاح و تعمیر کے لیے شریعت کی بجائے طرزِ فکر کی صحت و استواری کی اہمیت واضح کرنا چاہتا تھا اور یہ بتانا چاہتا تھا اگر زندگی کے بارہ میں طرزِ فکر صحیح اور صحت مند ہو، تو زندگی کی جزئیات آپ سے آپ سنور جاتی ہیں۔ سینٹ پال اس سلسلہ میں تاریخ و فلسفہ کی اس جانی بوجھی حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ زندگی کے معاملہ میں اس طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تجرید کافی نہیں ۔ زندگی بہر حال ایک تعین چاہتی ہے اور تہذیب و تمدن اور قانون و شریعت کے حسین امتزاج کی خواہاں ہے ۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ خود وہ روح جس کی ترقی کا وہ بہت بڑا علمبردار ہے جسم کی قید سے کب آزاد ہے ؟ غلط و صحیح قانون میں امتیاز کے معنی یہ تو ہرگز نہیں ہونا چاہئیں کہ سرے سے قانون ہی غیر ضروری ٹھہرے ۔ پال کے ساتھ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اس نے ایک طرف تو شریعت و فقہ کی اہمیتوں سے انکار کیا اور دوسری طرف ایسے چرچ کی بنیاد رکھی جس نے عیسائیت کو آخر آخر میں وہی طوق و سلاسل پہنا دیئے کہ جن کے خلاف انسانیت نے بغاوت کا عزم صمیم کر رکھا تھا یا جس کو وہ خود ختم کر دینے کا خواہاں تھا ۔ پال پہلا شخص ہے جس نے عیسائیت میں تحکم و اذعانیت (DOGMATLSM) کو رواج دیا ۔ اس کا تازہ ترین ثبوت بحرِ مردار سے برآمد شدہ (DEAD SEA SCROLL) وہ دستاویزیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی عیسائیت کن تصورات کی حامل تھی ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان دستاویزوں میں مستشرقین کے اس روایتی اعتراض کا جواب بھی موجود ہے کہ قرآن حکیم نے قصص کو جس اسلوب سے بیان کیا ہے اس کی تائید کتب مقدسہ سے نہیں ہو پاتی ۔ ان نوشتوں سے نہ صرف ان قصص کی تائید ہوتی ہے بلکہ عیسائیت کے بارہ میں بالکل نئے رُخ بھی نظر و بصر کے سامنے آتے ہیں ۔

ہمیں سر دست عیسائیت کے جس پہلو سے تعرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں بہر حال اذعانیت ہے اور اذعانیت ذہن و فکر کی موت ہے اس سے زندگی کی راہیں نہ صرف یہ کہ واضح نہیں ہو پاتیں ۔ الٹے اس میں خطرہ پنہاں ہے کہ ان کو مان کر انسان کے سوچنے کا انداز غیر علمی اور غیر سائنسی ہو جاتا ہے ۔ بھلا یہ چیز فکر و تعقل کی گرفت میں آنے والی ہے کہ عشائے ربانی میں روٹی کے جن ٹکڑوں کو شراب میں بھگو کر رکھا جاتا ہے وہ مسیح کے گوشت پوست اور خون کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔ کیا طبیعیات کا کوئی ماہر یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اس رسم کے دوران ایک لمحہ کے لیے بھی شراب کے قطرے خون کے قطروں کا روپ دھار لیتے ہیں ۔ یا روٹی کے ٹکڑے مسیح کا جسم بن جاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ آج کا انسان جو مزید روشنی چاہتا ہے اور مزید علم و تحقیق کا طالب ہے اس نوع کے اذعانیات تسلیم نہیں کر سکتا ۔

© rasailojaraid.com